

اس کا حقیقی اور خوب صورت کپڑے پہننا بھی عبادت ہے اور اگر وہ قیمتی کپڑے اپنی برتری کے اظہار اور تکبر کرنے اور اترانے کے لئے یا پرانی عورتوں کے بھانے کے لئے پہنے تو اس کا حقیقی کپڑے پہننا بھی گناہ ہے اور باعث عذاب ہے۔

غرض ہر مباح کام کے دو پہلو ہیں اگر وہ نیک نیت سے ہو تو وہ مستحب اور سنت ہے اور اگر وہ مباح کام برائی کی نیت سے ہو تو مکروہ یا حرام ہے اس لئے محققین نے کہا ہے کہ مباح الگ سے کوئی حکم شرعی نہیں ہے وہ ان ہی دس قسموں میں سے کوئی ایک قسم بن جاتا ہے اور مومن کامل کا کوئی فعل مباح نہیں ہوتا ہر فعل مستحب یا سنت ہوتا ہے اور فاسق اور بد چلن کا بھی کوئی فعل مباح نہیں ہوتا اس کا ہر فعل مکروہ یا حرام ہوتا ہے۔ احکام شرعیہ کی تعداد انکی تعریضات انکے احکام انکی مثالیں اور ان کے دلائل پر ہم نے بہت مفصل گفتگو کی ہے اور شاید کہ قارئین کرام کو احکام شرعیہ کی اس قدر تفصیل اور تحقیق کسی اور جگہ نہیں مل سکے گی۔

بیمار قوم اور اس کا علاج

علامہ سید محمد ہاشم فاضل ششی

سابق شیخ الادب، جامعہ اسلامیہ بہاولپور

سابق پرنسپل، علیہ انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، کراچی

امت مرحومہ جو خیر الامم ہے عقیدہ توحید کی امن ہے اس امانت داری کی رعایت سے شہر الامم اور امنار عالم سے طلب ہے چنانچہ اس گروہ امن کے آقا و مولیٰ کا ایک لقب رسول امن ہے اور اللہ و رسول کے مابین پیغام رساں کا نام و خطاب جبریل امن ہے اور کعبہ عبادت کا محل وقوع بلد امن ہے۔ الغرض امت مسلمہ اپنی صفات، سرمایہ اور وسائل کے لحاظ سے امن ہے خیانت و عذر کا یہاں گزر نہیں۔ عقیدہ توحید اسلام کا اس المال اور متاع خاص ہے اور یہ امت مرحومہ ہر حیثیت سے دنیا و آخرت کی ساری عمارتیں توحید ہی کی اساس پر تعمیر کرتی ہے ہر فکر و عمل کی ابتداء بھی توحید ہے وسط بھی توحید ہے اور انتہا بھی توحید ہے بحیثیت اور حلیہ کی گنجائش اسلامی فکر میں نہیں نکلتی، چنانچہ ذات الہی کی توحید، صفات الہی کی توحید، حقوق الہی کی توحید، انبیاء مرسلین کی توحید، کتب الہیہ کی توحید، بنی آدم کی توحید، جس کو فطری مساوات بھی کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ایسے ہمہ گیر وحدت خیز مذہب کے قیام میں اگر آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت کریں اور گروہ بندی و تحزب اختیار کریں تو یقیناً مقام حیرت ہے اور سمجھنا چاہیے کہ عقیدہ توحید کے اثرات ان کے ظاہری معاشرت و معاملات میں ست پڑ گئے ہیں دل سے توحید کے فوارے ابل کر ظاہر کو سیراب نہیں کر رہے ہیں۔ کہنا تو ذرا مشکل ہے کہ ایسے لوگوں کے دل انوار توحید کی مرکزیت کھو چکے ہیں اس لئے

مقالہ نگاروں کے لئے خصوصی ہدایات و اطلاعات

- ۱۔ مقالات علمی، فکری اور تحقیقی نوعیت کے ہونے چاہئیں۔
- ۲۔ مقالات نقلیہ اسکے سائز کے اوراق پر کاغذ کے صرف ایک طرف، خوش خطی سے لکھے جائیں۔
- ۳۔ کمپوزڈ مقالے، مع سی ڈی کے قابل ترجیح ہوں گے۔
- ۴۔ بھتر ہوگا کہ مقالہ کی اصل کاپی کے ساتھ، دوسرے قول بھی ارسال فرمائیں۔
- ۵۔ تمام مقالات ریفریز کی شدت رپورٹ کے بعد شائع کیئے جائیں گے۔
- ۶۔ مقالہ نگار حضرت پہلے سے شائع شدہ مضامین و مقالات ہرگز نہ بھیجیں ورنہ ان کے مضامین کی اشاعت، آئندہ کے لئے روک دی جائی گی۔

خصوصی نوٹ:

مجلس تقریر بعض نامور علماء اور مشاہیر اساتذہ کے جو علمی فکری اور تحقیقی مضامین انتخاب کر کے شائع کرتی ہے۔ وہ دراصل علمی و دینی خدمت کے پیش نظر ایسا کرتی ہے۔ مجلس تقریر سمجھتی ہے کہ نئے مکر غیر معیاری مضامین و مقالات سے کہیں زیادہ بھتر ہے کہ پرانے مگر معیاری مضامین شائع کیئے جائیں۔ ہمارے اس جذبہ کو ماہنامہ معارف اعظم گڑھ (انڈیا) نے اپنی ۵۰۰ ویں اشاعت میں سراہا ہے۔ مجلس اس تعریف پر ان کی شکر گزار ہے۔

خٹک سقوں میں نمی نہیں رہی دلوں کا حال اللہ کو معلوم ہے پھر کھاہری کیفیات سے امراض پھیلنے کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور مختلف جماعتات و افراد کے باہم نزاع کو دیکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے دلوں میں توحید کے جلوے باندھ پڑ گئے ہیں اور اسی بیماری کا اثر ہے کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جاتے ہیں۔

تشخیص مرض اور اس کا علاج

مرض تو خلاف طبیعت غیر معتدل کیفیات کا نام ہے اور مسلمانوں میں یہ بے اعتدالی موجود ہے جس کی وجہ سے ہم پوری ملت کو مریض و بیمار کہہ سکتے ہیں سوال یہ ہے کہ اس مرض عام دہائے عام کا علاج کیا ہے اور تمام ملت دو پارہ صحت و صحو کیونکر حاصل کر سکتی ہے۔

تجویز علاج سے پیشتر اسباب مرض کی تحقیق و تفتیش ضروری ہے جب تک قومی بیماری کا سبب دریافت نہ ہو جائے ممکن ہے تریاق بھی زہر کا اثر پیدا کرے اور بیماری زیادہ الجھ جائے۔

مفکرین کی رائے

ملت اسلامیہ کی تباہی کا درد ہر مسلمان کو ہے۔ علماء، صنایع، سیاس اور عوام سبھی اس غم میں مبتلا ہیں کہ اس قوم کا روگ معلوم کریں اور صحیح علاج سے اقوام عالم کے مقابلہ میں اس کو زیادہ صحت مند اور قوی تر بنادیں۔ مگر صدیوں تک مسلسل کوششوں کا نتیجہ یہی ہے کہ مرض بڑھتا جاتا ہے اور مریض کی صحت یابی دشوار تر ہوتی جاتی ہے۔

اسباب مرض کے متعلق لوگوں کی رائیں مختلف ہیں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس قومی تباہی کی علت مسلمانوں کا عمومی افلاس و غربت ہے لیکن ہم اس رائے سے متفق نہیں کیونکہ مسلمانوں میں صرف غرباء ہی نہیں بستے ہیں بلکہ بڑے بڑے دولت مند بھی ہیں اور دنیا کی تمام اقتصادی گردش کے مطابق ایک نیا شخص دولت مند بن کر ابھرتا ہے اور دوسرا گرہتا ہے اور دنیا میں کسی قوم کے تمام افراد مالدار نہیں ہوتے ہر قوم امیر و غریب کے مجموعہ کا نام ہے مگر جو تباہی مسلمانوں میں نظر آتی ہے وہ اوروں کے یہاں اس ہلاکت خیزی کے ساتھ نہیں ہے اس کے علاوہ قوموں کے عروج و زوال، صعود وبوط اور ترقی و تزلزل کی بنیاد سرمایہ دولت نہیں ہے خود اسلامی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ عہد رسالت اور اس کے قریبی زمانوں میں مسلمانوں کی جینیں مال و دولت سے خالی تھیں اور جسے دنیا افلاس و فقر کہتی ہے مسلمان اس کے کامل نمونہ تھے پھر بھی ہمارے قومی عروج و ارتقا کا وہی یادگار زمانہ ہے جس میں فقیر مسلمان دنیا کی تمام دولت مند اقوام پر غالب

آئے۔

اس لئے خود بے مائیگی کو ہم مسلم قوم کی تباہی کا سبب نہیں قرار دے سکتے بلکہ تجربات و واقعات کی روشنی میں فقیر مسلمانوں کے عروج و ترقی کا سبب ہے، بشرطیکہ انہیں اپنا سرمایہ اسلام کی خدمت اور مسلمان بھائیوں کی اعانت میں خرچ کریں۔ تو پھر جس طرح غیر مسلح، فائدہ کش قبیل اتحاد مسلمان پدر میں اپنے مقابل مسلح، دولت مند اور کثیر التعداد دشمنوں پر غالب آئے تھے آج بھی غالب رہیں گے اس لیے سرمایہ کی کمی و بیشی تباہی کی علت نہیں ہے ناکارہ دولت مندی بیماری کا اثر ہے۔

سیاسی ضعف

بعض مفکرین قومی تباہی کی علت اقتصادی بد حالی کے بجائے سیاسی بے تدبیری اور دور اندیشی کی کمی قرار دیتے ہیں اگر سیاست سے مراد صرف قومی بے تدبیری اور ملکی دوراندیشی کے علاوہ اس کے حدود خانہ داری سے لے کر انتظام مملکت تک وسیع ہیں تو یہی تو مسلمان قوم کی بیماری ہے اس کو بیماری کی علت کہنا درست نہیں اور اگر سیاست سے مراد صرف انتظام مملکت ہے تو اس کے معنی یہ ہونے کہ روگ اصل میں انتظام مملکت کا لگا ہوا ہے اور مسلمان عوام اس خارجی تاثیر سے متاثر ہو کر تباہ ہیں اور یہ غلط ہے کیونکہ ان ملکوں میں جہاں مسلمان صرف رعایا کی حیثیت سے آباد ہیں اور حکومت غیر قوموں کی ہے اس قسم کے خیالات کی گنجائش نکل سکتی ہے لیکن جہاں حکومت و عوام دونوں دعویداران اسلام ہوں حکومت کی بد نظمی کو قومی تباہی کی علت قرار دینا بے معنی ہے کیونکہ حکومت اگر جمہوری اور شورائی ہے تو قومی تباہی کے مجرم عوام ہیں جو اپنی رائے و مرضی سے مسندوں کے ہاتھوں میں عتاق مملکت دے دیتے ہیں۔ وہ پاگل مجرم نہیں ہے جو تلوار پا کر اپنی بے عقلی و جنون سے کسی کو قتل کر دے بلکہ مجرم اصل میں وہ شخص ہے جو پاگل کے ہاتھ میں مہلک ہتھیار دے دے۔ لہذا حکومت کی سیاسی و انتظامی بد اعمالیاں عوام کی قومی بیماری کا نتیجہ ہیں۔

اور اگر حکومت شخصی و شہنشاہی ہے تو ایسی حکومت کا وجود ہی قومی تباہی کی یادگار ہے اور جب تک مسلم عوام اپنے انسانی حقوق فطری آزادی اور اسلامی مساوات کی پامالی پر راضی رہیں گے وہ اور تباہ ہوتے جائیں گے۔

بے ہنری و جہالت

کچھ اہل فکر کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی قومی بیماری کی علت ان کی بے ہنری و جہالت ہے ان

میں سائنسدانوں اہل صنعت اور دیگر علوم متداولہ کے چاہنے والوں کی سخت ناپاکی ہے مگر یہ بھی کوئی معقول علت مرض نہیں کیونکہ آج صدیوں کی مسلسل کوششوں کے بعد بھی اقوام عالم علم و ہنر میں کوئی قابل رشک معیار قائم نہ کر سکی، کسی ترقی یافتہ ملک کا اوسط فیصدی معیار علمی ایسا نہیں جس کی کمی مسلمانوں کی قومی بیماری کا سبب کہلائے برخلاف یہود جو دنیا میں جمہوی اعتبار سے بہت دولت مند اور بڑے علم والے ہیں قومی لحاظ سے چنداں باعزت و با عظمت قوم نہیں جب سے یہودیوں پر ذلت اور مسکنت کی مہر لگا دی گئی اور ان کی اپنی مذہبی کتاب میں قومی تباہی کا ابدی اعلان کر دیا گیا اور اس مضمون کو قرآن مجید نے ایک ترمیم کے ساتھ دہرایا ہے یہود قومی لحاظ سے با وقعت نہیں ہیں کتاب مسیحیہ جو موجودہ یہودی بائبل کا بڑا اہم حصہ ہے یہودیوں کی ابدی پامالی کا اعلان کرتی ہے اور ان کی دائمی ذلت و مسکنت کی خبر رساں ہے قرآن حکیم نے بھی بنی اسرائیل کی اس ذلت و مسکنت کا بحوالہ کتب قدیمہ اعلان تو کر دیا مگر ساتھ ہی یہ ایک ترمیم کا اپنی طرف سے اضافہ کیا کہ **الا بحیل من اللہ وحیل من الناس**۔ انبیائے سلف کی نافرمانی و قتل کی وجہ سے بنی اسرائیل پر ذلت و مسکنت مسلط کر دی گئی اور اب ان کا قومی وجود خدا پرستوں یعنی مسلمانوں کے سہارے سے قائم ہو سکتا ہے یا دوسرے لوگوں کے سہارے اور مدد سے دنیا جانتی ہے کہ آج حکومت اسرائیل امریکہ و برطانیہ کی رچن منت ہے اور ان مسلمانوں کی درپردہ اعانت ہے جو انگریز و امریکہ کی خوشنودی کے لئے اسرائیل کی طرف سے خاموش ہیں قرآن مجید کے اس ترمیم شدہ اعلان کے بعد آج تک اس چودہ سو سال میں اسرائیلی حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی تھی اور اب تک بائبل کتاب مسیحیہ کی قدیم پیشین گوئی ہی کا ظہور تھا اگر حکومت اسرائیل نہ ہوتی تو قرآن مجید کی ترمیم بے معنی ہو جاتی لہذا رب العزت نے قرآنی ترمیم کی صداقت دنیا کے سامنے ظاہر کر دی۔ **کلام اللہ کا یہ ایک اعجاز ہے جس میں اب دنیا کی کوئی کتاب شریک نہیں ہے اہل مغرب عیسائی اسلام و مسلمان سے ایک طرف تو سخت عداوت رکھتے ہیں مگر دوسری طرف قدرت الہیہ انہی کے ہاتھوں سے قرآن کی تصدیق کرتی ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ**۔

خبر بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی مسلمانوں میں علم و ہنر کی کمی ان کی قومی بیماری کی کوئی معقول علت نہیں ہے نیز سوال یہ ہے کہ پچھلی چند صدیوں میں تو علم و ہنر کے خزینہ دار یہی مسلمان تھے اور قومی روگ لگا تو یہ چیزیں ان سے علیحدہ ہوتی گئیں لہذا علم و ہنر کی کمی مرض کی علت نہیں ہے بلکہ بیماری کی کیفیات ہیں۔

قائدین و علماء کی نافرمانی

بعض حضرات کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی قومی بیماری کی وجہ قائدین، زعماء، لیڈروں اور رہنماؤں کی نافرمانی اور توہین ہے۔ یہ بات تو سخت مضحکہ خیز ہے اس قوم نے اپنے منہ کے پیچھے چلنے کی جو مثال قائم کی ہے اور قوموں کی زندگی میں مشکل سے نظر آئے گی۔ تحریک خلافت پر مسلمان فدا ہو گئے اور قائد اعظم کی ایک آواز پر کچھ کم دس کروڑ انسانوں نے اپنی گردنیں جھکا دیں۔ لہذا لیڈروں کی اطاعت میں تو مسلم قوم اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ہاں اگر یہ کہیں کہ اس قوم کو صائب المرأے اور خیر خواہ لیڈر ہمیشہ نہیں ملتے تو بات معقول ہے مگر ایسا کیوں ہے وجہ ظاہر ہے قوم کی لیڈری ان کے اپنے افراد کے سپرد ہوتی ہے بیمار قوم میں پیدا ہونے والا لیڈر اس روگ کے آئینہ کے اثرات سے بالکل محفوظ کیونکر رہے گا قائد اعظم کی خیر خواہی مسلم ہجر اس کا کیا علاج کہ قیام پاکستان کے بعد اقتدار اعلیٰ کی کرسیوں پر ایسے لوگوں کو بٹھایا جو اپنے نظریات و اعمال میں مسلم لیگ اور پاکستان کے مخالف اور برطانیہ کے حمایتی تھے یہ بڑی امد و ہتاک غلطی ہوئی جس کی وجہ مسلمانوں کی قومی بیماری ہے۔

ایک بڑی جماعت کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی بیماری کا سبب مذہب سے اعراض و روگردانی ہے دنیا کی باطل پرست اقوام بھی اپنے مذہب و اہل مذہب کا بہت احترام کرتی ہیں اپنی معاشرتی زندگی میں ہزار بدکار ہوں لیکن اہل مذہب کے سامنے ان کی گردنیں احترام میں جھکی رہتی ہیں انگلستان میں اگرچہ مذہب و سیاست کے حدود علیحدہ ہیں۔ لیکن آج بھی اگر آرج بپ اپنی صلیب لئے مذہب کے نام پر باہر نکل آئے تو لاکھوں سرفضا میں اڑنے لگیں۔ اور ایوان حکومت کی اینٹ سے اینٹ بج جائے یہی حال پاپائے روم کا ہے مگر مسلمانوں میں علمائے دین کا کوئی مقام نہیں یہ اگر دین پر یا دینی عقیدہ پر قربان ہو جائیں تو قوم کھڑی تماشہ دیکھتی ہے۔

مثال کے لئے ایڈورڈ ہشتم اور ڈیوک آف وڈر سر کا واقعہ لوگوں کے ذہن میں ہنوز تازہ ہے آرج بپ نے شہنشاہ برطانیہ کو مہربان سے عہد مناکحت کی اجازت نہیں دی تو فرما ماروائے برطانیہ کو حقوق شہرانی سے محروم ہونا پڑا اس کے علاوہ اور بھی متعدد مثالیں ہیں جن میں آرج بپ کا فیصلہ اہل اقتدار اور فرمانروائے انگلستان کی اپنی رایوں پر غالب رہا۔

علمائے دین کی اہانت کی گرم بازاری کیوں ہے اگر اس کی وجہ علماء کا افلاس ہے تو یہ بڑی نا معقول بات ہے کیونکہ اسلام میں کرامت و ذلت کی بنا مالدار کی و افلاس تو ہے نہیں دوسرے پورے سو

ان کے کاروبار میں رہنما اور معاون ہوتی ہیں وہ لوگ اسی کے ساتھ ایک ایسی انجمن بھی بنائیں جو قومی و اسلامی بنیاد پر ان کے کاروبار کی نگرانی ہو، لوٹ کھسوٹ، چور بازی ملاوٹ اور اخترا ان (Hoarding) سے کوئی بڑے سے بڑا سرمایہ دار کیوں نہ بن جائے جب قومی بیماری بڑھ کر فتنہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو داخلی شورش یا خارجی دباؤ آگ بن کر سرمایہ اور سرمایہ داری کو خاکستر بنا دیتی ہے اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ ہولناک ہے۔

اسی طرح دفتروں کے ملازمین اور چہرہ اسموں کی جماعت اپنی جداگانہ انجمنیں بنائے ہوئے ہیں تاکہ اپنے حقوق کی حفاظت کر سکیں اگر ان انجمنوں کے ساتھ وہ لوگ ایک ایسی سوسائٹی بھی قائم کر لیں جو تمام اہل پیشہ کے اندر قومی شعور اور اسلامی احساس پیدا کرے تو اس کے اثرات خود ان کے اپنے حق میں مفید و باعث ترقی ہوں گے رشوت ستانی، سستی، کام چوری، افسروں کی شکایت، ماتحتوں کی تذلیل منافرت پیدا کرتی ہے اور ماحول کو بگاڑ دیتی ہے۔

عوام حکومت و اہل اقتدار کے متعلق کچھ کہنا فضول ہے یہ لوگ تو ہماری بیماری کے نچوڑ ہیں ان کا معالجہ بعد میں ممکن ہوگا۔ علمائے دین بہت بدنام ہو چکے باہمی آویزش نے ان کو اور بھی گرا دیا جو لوگ علماء کی بے قدری کی وجہ ان کے باہمی نزاعات قرار دیتے ہیں وہ سراسر غلطی میں مبتلا ہیں یورپ کی تاریخ اور کلیسا کے واقعات کو یاد کیجئے کہ عیسائیوں کی مذہبی گروہ بندیوں نے کیا کیا ظلم توڑے اور کس کس طرح انسانیت کا گلا گھونٹا چاہا۔ علمائے اسلام کے جھگڑوں میں ایسی تباہیوں کا اثر عشر عشر بھی نہیں ہے مگر نادانی تو دیکھئے کہ بعض مسلمان جنہیں اپنی مغربی تعلیم پر ناز ہے عیسائی گروہ بندیوں اور اہل مذہب کے مظالم کو اسلام اور علمائے اسلام پر چکاویٹے ہیں اس کی وجہ قومی بیماری ہے۔

لہذا اہم علمائے دین سے موذبانہ عرض کرتے ہیں کہ ایسی تمام باتیں جن کا تعلق قرآن و سنت کی ظاہری نصوص سے نہیں ہے مدار تکفیر و تقسیق قرار نہ دیں اور مباحثات کے متعلق افراد امت کو آزاد چھوڑ دیں تاکہ ہر شخص اپنی صوابدید اور پسند سے جو روش چاہے اختیار کرے۔

اہل سنت کے عقائد جو پچھلے مسئلہ کتابوں میں درج ہیں۔ جن کو ہر فرقہ دل سے قبول کرتا ہے آج بھی صرف انہیں پر اکتفا کیا جائے۔ ان کے خلاف کسی چیز کو ماننے اور قبول کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ کیونکہ مسلمان اہل سنت ہی حقیقی معیار ہدایت ہیں۔

مستند علماء کی ادھر ادھر کی تحریروں کو ان کی اپنی ذمہ داری کے سپرد کر دیا جائے اس طرح مختلف

کرنا اور علماء دین کو فائدہ کش بنانا بھی تھا لیکن دین حق کو برقرار رکھنے میں عیسائی کیا دیاں ناکام رہیں اور حق پرست گروہ تمام آفات و مصائب کو جھیلتا ہوا علوم نبویہ (علی صاحبہا علیہ الصلوٰۃ والسلام) ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچا تا رہا سوال یہ ہے کہ اب تو عیسائی چلے گئے مگر علوم دین و علمائے دین پر راہ معیشت کیوں بند ہے اور ان پر افلاس کیوں مسلط ہے ان پر معاشرت اور وفاتر حکومت کے دروازے کیوں نہیں کھولے جاتے نہ اہل اقتدار کو اس کا خیال ہے اور نہ مسلمان قوم کو کوئی فکر، یہ کیفیت بھی ای قومی بیماری کی ہے جس میں مسلمان قوم بحیثیت مجموعی مبتلا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ مسلمان عوام ناواقف ہیں اس لئے علوم دینیہ اور علمائے دین کی اہمیت نہیں سمجھتے تو یہ بالکل غلط ہے مسلمان عوام اسلام کے متعلق اتنا کچھ جانتے ہیں جو باطل پرست قوموں کے عوام نہیں جانتے بلکہ ان کے غیر مذہبی علم رکھنے والے گریجویٹ اور پی ایچ ڈی بھی اپنے مذہب سے ناواقف ہیں ایٹمیائی عیسائیوں کو جانے دیجئے بارہا یورپین عیسائیوں سے بھی ساجتہ پڑا ہے۔

آپ ایک بات اور یاد رکھیے کہ آج اسلامی تصانیف رسائل مضامین کی اشاعت اور علماء و واعظین کی تقاریر کی جس قدر کثرت ہے پچھلے دنوں یہ کثرت نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود مذہب سے بیگانگی اور لاپرواہی جس شدت سے آج دیکھی جا رہی ہے وہ گذشتہ ادوار میں نہیں تھی۔

فرض اس سلسلہ میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے وہ سب بیماری کے اثرات ہیں بیماری کے اسباب نہیں ہیں اور جب تک علت کی دریافت کے بعد معالجہ نہ ہو تباہی مسلط رہے گی۔

بیماری اور اس کا علاج

آپ سوال کریں گے کہ علت مرض اور اس کا علاج کیا ہے بفضلہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کی قومی بیماری کے اسباب و معالجہ سے واقف ہیں لیکن محض تفریح طبع یا علمی دلچسپی کے لئے ان کا ذکر لایعنی اور فضول ہے اعلیٰ ترین و مجرب نسخے بھی دفع مرض کے لئے بیکار ہیں اگر مریض خود دفع مرض کا آرزو مند نہ علاج سے دلچسپی اور نسخہ کے استعمال کی لگن نہ ہو واقعی اگر مسلمان قوم جماعتی لحاظ سے علاج کی طلبگار ہو اور ہمیں اس کا یقین آجائے تو ہم علت مرض اور نسخہ بتا دینے کے لئے تیار ہیں جس سے صحت ضرور حاصل ہو گی۔

مگر اس معالجہ اور اعلان علاج سے پہلے حقیقی طلب معلوم کرنے کی شرط ہے کہ لوگ اپنے اپنے حلقے میں صحیح قومی و اسلامی شعور پیدا کریں۔ مثلاً تجارت پیشہ حضرات کی مختلف تجارتی شاخوں میں

دین کا جذبہ پیدا کریں اور جماعت سازی سے تائب ہوں لیڈروں سے گزارش ہے کہ قیادت کا بیڑہ اٹھانے اور اسٹیبل کی رکنیت اختیار کرنے کے بدلے عوام میں سیاسی شعور پیدا کریں۔

طلبہ کی انجمنیں ہیں یہ ان انجمنوں کے ساتھ ایک ایسا ادارہ بھی بنالیں جس کے ذریعہ سے وہ اپنے نظریات و اعمال کو قومی و اسلامی سانچہ میں ڈھال سکیں تو یہ طریقہ کار نہ صرف ان کی اپنی موجودہ زندگی کے لئے کارآمد ہے بلکہ قوم کی آئندہ تکفیل میں بھی مفید کارآمد، یہ لوگ عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی درستی سے آئندہ نسل درست ہو سکے گی۔

اسکول و کالج کے اساتذہ کی بھی انجمنیں ہیں اگر ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد میں یہ ایک دفعہ بڑھالیں جس کی رو سے ان کی نظری و علمی اصلاح، قومی و اسلامی اساس پر ہو تو بحیثیت جمعی قومی بیماری کا علاج آسان ہو جائے گا۔ کیونکہ یہی لوگ اپنے قومی چاک پر تعلیم یافتہ دماغ گھڑتے ہیں۔

اصلاح نظر

جس طرح انفرادی زندگی اور اس کی تزئین و آرائش کے لئے تین امور بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۔ ذاتی صلاحیت ۲۔ بہر ماحول ۳۔ مناسب سعی

اسی طرح قومی اصلاح و برتری کے لئے بھی تین چیزیں بنیادی ہیں۔

۱۔ قومی شعور ۲۔ جماعتی خیر خواہی ۳۔ مشترک کوشش

مذکورہ باتوں میں سے جو چیزیں جس حد تک ناقص یا ناپید ہوں گی قومی عروج کی منزل اسی تناسب و معیار سے دور ہوتی جائے گی۔

بدقسمتی سے مسلمان قومیت کے ان تینوں ترکیبی عناصر سے محروم ہیں نہ ان میں صحیح قومی شعور ہے نہ جماعتی خیر خواہی کی کوئی علامت نظر آتی ہے اور نہ مشترک کوشش کا نشان ہے۔ حالات کا جائزہ مطالعہ اور موجودہ مسلمانوں کی نفسیاتی تحلیل سے ظاہر ہے کہ ان کا خیال مطلق نظر بکسر بدلا ہوا ہے جب تک اس غلط نظری کی اصلاح نہ ہوگی اس قوم کی دوبارہ اپنے مرکزی طرف مراجعت ناممکن ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مسلمان پیدائش سے موت تک اسلام کے ظاہری ہدایات پر عمل کرتے ہیں جہاں جاتے ہیں دیکھتے ہی دیکھتے متعدد مسجدیں تعمیر ہو جاتی ہیں، پنجگانہ نماز میں نمازیوں کی خاصی تعداد جمع ہوتی ہے رمضان میں روزہ داروں کی بھی معقول تعداد ہے مالدار زکوٰۃ و صدقات بھی ادا کرتے ہیں مدارس و مکاتب کی بنیادیں بھی پڑ جاتی ہیں۔ تجارت پیشہ حضرات صنعت و تجارت کے میدان میں دوڑ

لگاتے ہیں دفاتر حکومت میں بھی کچھ نہ کچھ دیانتدار افراد پائے جاتے ہیں۔ پارلیمان اور کابینہ میں کبھی غدار و خود غرض نہیں ہوتے مگر کیا وجہ ہے کہ قوم ہروں کے مال کار سے برابر متاثر ہوتی جاتی ہے اور نیکو کاروں کے اثرات نتیجہ خیز نہیں ہوتے صاحبین کے طفل میں بدکاروں کی اصلاح کیا ہوتی یہاں تو ہر شعبہ زندگی و میدان عمل میں بدی کا غلبہ ہے۔

تجدلی نظر

اسی نفسیاتی حقیقت کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے کہ جب اللہ بزرگ و برتر کسی قوم کو برا و کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے ان کی عقل بے کار کر دی جاتی ہے چنانچہ قدیم و جدید اقوام کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ایک ترقی یافتہ ملت کا ستر زوال بے عقلی کے نقطہ سے شروع ہوتا ہے یعنی زوال پزیر قوم نہ تو کسی آسانی، زمینی یا مومی آفت سے اچانک مفلس و فلاش ہو جاتی ہے نہ اس کے تمام رجال کار سیاسی، علماء، اصناف، جنرل وغیرہ کسی وبائی مرض سے ایک ساتھ مر جاتے ہیں۔

بلکہ انسانی خصوصیات و صلاحیتیں افراد میں جدا گانہ طور پر علیٰ حالہ قائم و برقرار رہتی ہیں۔ علم و عمل کے ہر شعبہ میں تباہ شدہ قوم کے لوگ اعلیٰ و متوسط معیار پر مشغول نظر آتے ہیں فرق یہ ہوتا ہے کہ افراد قوم کی صلاحیتیں جو بیشتر اپنی ہی قوم کی تعمیر میں صرف ہوتی تھیں وہ اب کسی اور غالب قوم کے تفوق و برتری کا ذریعہ بن جاتی ہیں مثلاً برطانوی دور اقتدار میں ہندوستان ہمیشہ اپنے صنعت کا روصاحب قلم پیدا کرتا رہا اور مایہ ناز فوج بھی مہیا کرتا رہا مگر ہر کامیابی کا انجام تاج برطانیہ میں چند اور لعل و جواہر کا اضافہ تھا اور برطانوی قوم کی دولت و سرمایہ کی افزونی تھی۔

ایسا کیوں ہوتا ہے

اس تباہی کی وجہ صرف ایک ہے ساری ملت کا نقطہ نظر انفرادی و اجتماعی لحاظ سے بالکل بدل جاتا ہے خیر و شر اور نفع و نقصان میں تمیز باقی نہیں رہتی ان کی عقلیں اس حد تک ماؤف ہو جاتی ہیں کہ وہ اپنے کسی عمل کا مالی کار نہیں دیکھ سکتے۔ جس طرح ایک جانور کی نگاہ چاروں طرف میں ایک محدود قاصد تک کام کرتی ہے ماضی کے واقعات اور مستقبل کے نتائج بہائم کی آنکھوں سے اوچھل جاتے ہیں اور دونوں کے درمیان کوئی ربط و سلسلہ نظر نہیں آتا یہی حال کسی زوال پزیر ملت کا ہوتا ہے وہ ماضی سے نا آشنا مستقبل سے غافل ہو کر بہترین قومی شعور و احساس سے نااہل ہو جاتی ہے۔

کیا عقل کا ناکارہ پن اور نظر کی کوتاہی بے سبب عذاب الہی ہے جو محض اظہار اقتدار کے لئے

کسی قوم پر مسلط ہوتا ہے قرآن اس کا جواب نفی میں دیتا ہے اور انسانیت کی تاریخ بھی اعلان خداوندی کی تصدیق کرتی ہے۔

قوم جب خود اپنی حالت بدلنا شروع کرتی ہے تو فطرت کا سلوک بھی انہیں تعمیرات کے مطابق ہوتا ہے گری ہوئی ملت ترقی کی طرف قدم بڑھائے تو فطرت دیکھیری کرتی ہے اور کوئی ترقی یافتہ قوم بلندی سے اترنا چاہے تو فطرت اس کا راہ نہیں روکے گی مگر قومی بیماری، نقطہ نظر کا تغیر اور عقل کی ناکارگی کی ابتداء قوم کے بلند نشین طبقے سے شروع ہوتی ہے۔

اہل اقتدار اگر قومی امانت یعنی حکومت کو ذاتی، موروثی ملکیت بنانا چاہیں علماء پندار و برتری میں مشغول ہوں سرمایہ دار طبقہ عوام کی طرف سے آنکھیں پھیر لے تو پھر وہ نگاہ جس کی وسعت پوری ملت کو محیط رہے رفتہ رفتہ اپنے گرد و پیش میں محصور ہو جاتی ہے اور یہی وہ منزل ہے جہاں انسانی نگاہ حیوانی نظر کے سانچے میں ڈھل کر حیوانیت اختیار کر لیتی ہے اور جانوروں کی طرح اس انسانی معاشرہ کو دوسرے لوگ اپنی خدمت گزاری کے لئے مملوک و غلام بنا لیتے ہیں۔

تکبر و خود غرضی

الغرض کسی ترقی یافتہ ملت کی چاہی کے لئے مہلک جراثیم صرف دو ہیں۔ ایک باہمی تکبر دوسرے خود غرضی۔ جب کسی قوم کے بالائین افراد کے دل ذاتی غرض اور ذاتی برتری یعنی تکبر سے پاک رہتے ہیں۔ اور ہر شخص ناپائیدار و عارضی مراتب کے فرق سے قطع نظر ہو کر ملت کے دوسرے تمام افراد کے برابر اپنے آپ کو سمجھتا رہے گا اور تمام انسانے قوم کے دوش بدوش قومی ذمہ داریاں سنبھالے گا برتری و کستری کے تصورات مٹا کر صحیح مساوات اختیار کرے گا ممکن نہیں ہے کہ اس کی قوم پست و ذلیل ہو سکے اور جس تناسب سے خود غرضی و تکبر کے جراثیم پیدا ہوں گے اسی معیار سے قومی پستی و ترقی کا اندازہ ہوتا جائے گا۔

چنانچہ آج بھی ماشاء اللہ نمازیوں کی ظاہری تعداد خوش کن ہے دنیا کی دوسری قوموں کے لوگوں کے مقابلہ میں مسلمان عبادت گزار پھر بھی زیادہ ہیں مگر نمازی و دینی غرض کا حال تو خدا کو معلوم ہے جہاں تک ظاہری اثرات کا تعلق ہے وہ جگہ جگہ اجتماع کے بعد بھی ان میں باہم اخوت و مساوات اور قومی یکگت مفقود ہے طبقاتی اختلاف کا اندازہ نمایاں ہے برتری و کستری، تکبر و حقیر کی بیماری صاف دکھائی دیتی ہے۔ اور ہر طبقہ کے تمام افراد اپنی ذاتی غرض اور ذاتی برتری کے لئے کوشاں ہیں تجارت و صنعت والے جائزہ ناجائز ذرائع سے زیادہ سے زیادہ دولت کی دھن میں لگے ہوئے ہیں، کیوں کہ ملت کی فلاح و ترقی

دراصل ان کی بڑائی اور کرامت کا ذریعہ ہے اگر دولت نہ ہو تو تکمیل غرض اور تکبر کی گنجائش نہیں رہے گی۔ تجارت پیشہ افراد کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ انکے حرص مال سے قومی تباہی پیدا ہو رہی ہے دولت کی گردش رکتی ہے عوام بھوکوں مرتے ہیں غذائیات کی آمیزش معزز صحت اور جان لیوا ہے مسجدوں کی تعمیر میں اہمیت تو کیا ہوگی نفوت و خود غرضی کی اینٹیں مسجدوں کی بنیادوں میں رکھی ہوئی ہیں، مدارس دینیہ کے قیام کی غرض مذہبی دکانداری سے زیادہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ بنیادیں مدارس عموماً حقوق تولیت اپنی ذات اور ورثا میں محدود رکھتے ہیں اور وہ علوم و فنون جن سے خود آشنائیں اور سارے معاشرے کو ان کی ضرورت ہے اپنے مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل نہیں کرتے کیونکہ مستقبل میں حقوق تولیت کو خطرہ معلوم ہوتا ہے۔

زکوٰۃ و صدقات سے مالداروں کی غرض یہ نہیں ہوتی کہ پس انداز دولت دراصل عوام کا حصہ ہے جو معاملہ کے الٹ پھیر سے ان کے پاس آگئی ہے لہذا زکوٰۃ و صدقہ کے ذریعہ حق جھکا کر رسید پر عمل کر رہے ہیں بلکہ اس دینی و معاشرتی عمل کا مقصد بھی اپنی برتری کا احساس و اظہار ہوتا ہے۔

تبدیل نگاہ کا نتیجہ

جب کسی قوم و افراد قوم کا مطلع نظر بدل جاتا ہے اور جداگانہ طور پر ہر شخص کو خود غرضی و ذاتی برتری کا گھن لگ جائے تو پھر اس کی نگاہ میں اپنا دور عروج بھی نشان پستی نظر آتا ہے عقل کھولنے اور نظر بدلنے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہر وہ چیز جو قومی ترقی کے زمانہ میں ابنائے ملت کا سرمایہ اخلاقی و ذلیل و حقیر دکھائی دیتی ہے اور ان میں سے ہر بات کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور برائت ظاہر کی جاتی ہے۔

اپنے معلم تمدن، برطانیہ ہی کے رسم و رواج پر ایک نگاہ ڈالیں تو ان کو معلوم ہوگا کہ تاج پوشی اور انتخاب صدر کے معاملات میں کیا کیا ریمیں ادا ہوتی ہیں مگر کسی ترقی یافتہ انگریز نے آج تک ان مراسم کا اختلاف اور توہین نہیں کی۔

چرچ سے سیاست الگ ہے مگر عوام و خواص کوئی بھی چرچ یا اس کی ہدایات کا مذاق نہیں اڑاتا۔ یہ اس لئے ہے کہ غیر قوموں میں شعور باقی ہے لیکن مسلمانوں کا نقطہ نظر بدلا ہوا ہے اپنی ہر بات بری معلوم ہوتی ہے اور غیروں کی انسیات تک ان کی نگاہ کی رسائی نہیں۔

قومی ترقی کے لئے سب سے پہلے مسلمانوں کو اپنا نقطہ نظر بدلنا ہوگا۔ خود غرضی تکبر کے بدلے قومی مفاد و ملی مساوات کا دم بھرنا ہوگا اور اپنی ہر چیز کی توقیر کرنی ہوگی جو کچھ چیزیں دور ترقی کی یادگار کے طور پر دراصل ملی ہیں ان سے محبت کرنا ہوگی پھر وہ منزل نظر آئے گی جس کی طرف پیش قدمی کا نام ترقی

عید، انسانی فطرت کا تقاضہ

سال میں چند ایام جشن، تہوار اور عید کے طور پر دنیا کی تمام اقوام و ملل اور مذاہب میں منائے جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر قوم، مذہب و ملت کے لوگ اپنے ایام عید کو اپنے اپنے عقائد، تصورات، روایات اور ثقافتی اقدار کے مطابق مناتے ہیں، لیکن اس سے یہ حقیقت ضرور واضح ہوتی ہے کہ تصور عید انسانی فطرت کا تقاضہ اور انسانیت کی ایک قدر مشترک ہے۔ مسلمان قوم چونکہ اپنی فطرت، عقائد و نظریات اور ملی اقدار کے لحاظ سے دنیا کی تمام اقوام سے منفرد و ممتاز ہے۔ اس لئے اس کا عید منانے کا انداز بھی سب سے نرالا ہے، بقول علامہ اقبالؒ:

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

اور اقوام کی عید محافل ناؤ نوش و رقص و سرود بجا کرنے، دنیا کی رنگینیوں اور رعنائیوں میں کھوجانے، مادر پدر آزاد ہو کر بد مستیوں میں ڈوب جانے، تمام اخلاقی اقدار کو تہہ دینے، نفسانی خواہشات اور مصلیٰ جذبات کو فروغ دینے اور ”آج یا پھر کبھی نہیں“ کے مصداق ہوں نفس کا سیر بن جانے کا نام ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں روح کی لطافت، قلب کے تزکیئے، بدن و لباس کی طہارت اور مجموعی شخصیت کی نفاست کے ساتھ بعد ہجر و انکسار خشوع و خضوع تمام مسلمانوں کے اسلامی اتحاد و اخوت کے جذبے سے سرشار ہو کر اللہ رب العزت کی بارگاہ میں سجدۂ بندگی اور نذرانہ شکر بجالانے کا نام عید ہے۔

قرآن مجید میں ذکر عید

قرآن مجید میں سورۃ مائدہ آیت ۱۱۳ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک دعاء کے حوالے سے عید کا ذکر موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قال عیسیٰ ابن مریم اللہم ربنا انزل علینا مائدہ من السماء تكون لنا عید الاولنا و اخرنا وایة منک ج وارضقنا وانت خیر الرازقین۔

”عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) نے عرض کیا کہ اے اللہ! ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان اتار دے (اور اس طرح اس کے اترنے کا دن) ہمارے لئے اور ہمارے انگوں، پچھلوں کے لئے (بطور) عید (یا دگر) قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو اور ہمیں رزق عطا فرما اور تو بہترین رزق عطا فرمانے والا ہے۔“

عید کا تاریخی پس منظر، عظمت اور فلسفہ

مفتی منیب الرحمن

چیرمین مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان

سابق رکن اسلامی نظریاتی کونسل (حکومت پاکستان)

روح کی لطافت، قلب کے تزکیہ، بدن و لباس کی طہارت اور مجموعی شخصیت کی نفاست کے ساتھ بعد ہجر و انکسار و بعایت خشوع خضوع تمام مسلمانوں کا اسلامی اتحاد و اخوت کے جذبے سے سرشار ہو کر رب العزت کی بارگاہ میں سجدۂ بندگی اور نذرانہ شکر بجالانے کا نام عید ہے۔

لفظ عید کے معنی اور وجہ تسمیہ

عید کا لفظ عود سے ماخوذ ہے جس کے معنی لوٹنا ہے۔ چونکہ یہ دن مسلمانوں پر بار بار لوٹ کر آتا ہے، اس لئے اس کو عید کہتے ہیں (بحوالہ لسان العرب معصف علامہ ابن منظور افریقی) ابن العربی نے کہا کہ عید کو ”عید“ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ دن ہر سال مسرت کے ایک نئے تصور کے ساتھ لوٹ کر آتا ہے۔ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ مسرت اور خوشی کے دن کو عید، نیک شگون کے طور پر کہا جاتا ہے تاکہ یہ دن ہماری زندگی میں بار بار لوٹ کر آئے، جس طرح ”قافلہ“ کے معنی ہیں ”لوٹ کر آنے والا“ اہل عرب قافلہ کو بھی نیک شگون کے طور پر قافلہ کہتے ہیں۔ گویا اس کے پیچھے یہ آرزو اور تمنا کارفرما ہوتی ہے کہ جس مقصد کے لئے جا رہا ہے اس میں کامیاب و کامران ہو کر عافیت اور سلامتی کے ساتھ اپنی منزل پر واپس آ جائے۔ چونکہ رب تبارک و تعالیٰ اس دن اپنے مقبول اور عبادت گزار بندوں پر اپنی ان گنت نعمتیں اور برکتیں لوٹاتا ہے اس لئے اسے عید کہتے ہیں۔

اس سے اگلی آیت میں ارشاد خداوندی ہے:

قَالَ اللَّهُ إِنِّي مَنَزَلُهَا عَلَيْكُمْ جَ فَمَن يَكْفُر بَعْدَ مَنكُم فَأَنِّي أَعَذِّبُهُ عَذَابًا لَا
أَعَذِّبُهُ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ (المائدہ: ۱۱۵)

”اللہ نے فرمایا کہ میں یہ (خوان) تم پر اتار دوں گا مگر اس کے بعد تم میں سے جو کفر کرے تو میں اسے ایسا عذاب دوں گا جو سارے جہانوں میں اور کسی کو نہ دیا ہو“

رہا یہ سوال کہ عائے یحییٰ علیہ السلام کے قبیۃ میں ان کی قوم پر یہ خوان اترا یا نہیں، قرآن نے اس سلسلے میں سکوت اختیار فرمایا ہے، البتہ تفاسیر میں دونوں طرح کی روایات موجود ہیں۔ ہمارے زیر بحث موضوع سے جو بات متعلق ہے وہ یہ ہے کہ کسی قوم کے مسرت کے دن کا قرآن نے عید کے عنوان سے ذکر کیا ہے اور جو دن کسی قوم کے لئے اللہ کی کسی خصوصی نعمت کے نزول کا دن ہو وہ اس دن کو اپنا عید کہہ سکتی ہے۔

عید میلاد مصطفیٰ ﷺ کا ثبوت ایک لطیف حیرائے میں

مفسر قرآن مولانا سید محمد فہیم الدین مراد آبادی قدس سرہ نے قرآن مجید کے اپنے تفسیری حاشیے ”خزائن العرفان“ میں اس مقام پر ایک لطیف نکتہ آفرینی کی ہے۔ وہ یہ کہ جب اللہ کی خصوصی نعمت کے نزول کا دن عید قرار پاسکتا ہے اور قرآن ایک طرح سے اس کی توثیق کر رہا ہے تو اگر امت محمدیہ ﷺ اللہ کی نعمت عظمیٰ محمدیہ ﷺ کی ولادت باسعادت کے دن کو ایک عید کے طور پر منائے تو انہیں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیئے۔

اسلام میں عید کا آغاز

خالص اسلامی فکر اور دینی مزاج کے مطابق اسلامی تمدن، معاشرت اور اجتماعی زندگی کا آغاز ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں ہوا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی مدنی زندگی کے ابتدائی دور میں عیدین کا مبارک سلسلہ شروع ہو گیا تھا جس کا تذکرہ سنن ابی داؤد کی مندرجہ ذیل حدیث میں ملتا ہے۔ ”حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اہل مدینہ دو دن بطور تہوار منایا کرتے تھے جن میں وہ کھیل تماشے کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا ”یہ دو دن جو تم مناتے ہو“ ان کی حقیقت اور حیثیت کیا ہے؟ (یعنی ان تہواروں کی اصلیت اور تاریخی پس منظر کیا ہے؟) انہوں نے عرض کیا کہ ہم عید جاہلیت میں (یعنی اسلام سے پہلے) یہ تہوار اسی طرح منایا کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اللہ

تعالیٰ نے تمہارے ان دونوں تہواروں کے بدلے میں تمہارے لئے ان سے بہتر دو دن مقرر فرمادیئے ہیں، یوم (عید) الاشیٰ اور یوم (عید) الفطر۔“

عید کے ایام کو مقرر کرنے کی حکمت

یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیوں نہیں کر دیا کہ نوروز اور مہرجان کے انہی تہواروں کی اصلاح فرمادیتے اور ان میں جو رسوم شرعی اعتبار سے منکرات کے زمرے میں آسکتی تھیں، ان کی ممانعت فرمادیتے اور اظہار مسرت کی جو جائز صورتیں تھیں وہ اختیار کرنے کی اجازت دے دیتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں اللہ کی حکمت کا فرما تھی۔ دراصل ہر چیز کا ایک مزاج اور پس منظر ہوتا ہے۔ آپ لاکھ کوشش کریں کسی چیز کو اس کے عقلی مزاج اور تاریخی پس منظر سے جدا نہیں کر سکتے۔ لہذا جس چیز کی اساس کسی شر پر رکھی گئی ہو اس کی کانت پھانٹ اور بناؤ سنگھار سے کوئی خیر پر مبنی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا اور اسلام تو آیاتی اس لئے ہے کہ کفر اور بدی کے اثرات کو مٹایا جائے۔ معلوم ہوا کہ اسلامی معتقدات اور خالص دینی فکر اور شرعی مزاج کا تقاضہ یہ تھا کہ مسلمانوں کا تعلق تمام جاہلی رسوم اور کافرانہ شعائر سے یکسر ختم کر دیا جائے تاکہ عہد جاہلیت کی تمام علامات سے کٹ کر ان میں صحیح دینی فکر پیدا ہو سکے۔

چونکہ اسلام دین فطرت ہے اس لئے اس نے جہاں اپنے ماننے والوں کو لادینی نظریات سے محفوظ رکھا وہاں ان کے صحیح جبلی اور فطری تقاضوں کی آبیاری بھی کی، عید منانا انسانی فطرت کا تقاضہ تھا لہذا مسلمانوں کو ایک کی بجائے عیدین کی دو ہری نعمت عطا فرمائی۔

یوم عید کے مستحبات

عید کے دن یہ امور مستحب ہیں: حجامت بنوانا، ناخن تراشنا، غسل کرنا، مسواک کرنا، خوشبو لگانا، اچھے صاف سترے یا دستیاب ہوں تو نئے کپڑے پہننا، صبح کی نماز مسجد میں پڑھ کر عید گاہ پہلے جانا۔

عید گاہ جاتے وقت راستہ تبدیل کرنا

سنّت یہ ہے کہ جس راستے سے عید گاہ جائے، نماز پڑھ کر اس راستے کے بجائے دوسرے راستے سے گھر واپس جائے۔ بخاری شریف میں حدیث ہے:

”حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عید کے دن نبی اکرم ﷺ (عید گاہ آتے

Seminar Library
Department of Islamic History
University of Karachi

”الرسول النبی الامّی“ کا معنی مرادی

محمد عارف خان ساقی

استاذ شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

نحمدہ و نصلی و نسلم علی الرسول النبی الامّی والہ
واصحابہ واملتہ اجمعین۔

قرآن مجید میں حضور رسالت آپ ﷺ کی ایک صفت ”الرسول النبی الامّی“ بیان ہوئی ہے۔ جس انداز سے قرآن حکیم نے آپ ﷺ کیلئے یہ کلمہ استعمال کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ انہی ہونا آپ ﷺ کا وہ امتیازی وصف ہے جس سے بنی اسرائیل کے انبیاء کرام و رسولان عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام متصف نہیں ہوئے۔ اس معاملے میں اب تک ہمارے علماء کے درمیان یہ بحث چل رہی ہے کہ قرآن حکیم میں آپ ﷺ کے لئے الرسول النبی الامّی کے کلمات کو ایک امتیازی وصف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، تو یہاں ”امّی“ سے کیا مراد ہے؟ چنانچہ اس سلسلے میں علماء کے متعدد اور مختلف اقوال ہیں۔

یوں تو انبیاء کرام کو ان کے حالات و زمانہ اور معروضی ضرورتوں کے تحت فضائل و معجزات سے سرفراز فرمایا گیا اور یکسانی و مساوات کہیں نہیں پائی جاتی۔ ہر ایک کی اپنی خصوصیات ہیں اور ہر کسی کے اپنے امتیازات۔ مگر آپ ﷺ کا امّی ہونا محض ایک امتیازی وصف ہی نہیں بلکہ نبی موعود کی شناخت و پہچان کی ایک علامت خاص بھی ہے۔ ایک ایسی علامت جس کے فہم پر نبی موعود کی پہچان اور شناخت موقوف ہے۔ علامت اور نشان کے درست تعین اور فہم کامل کے بغیر مقصود تک رسائی چونکہ ممکن نہیں ہوتی اس لئے اس کے فہم عقلی کا حصول اور درست تعین بادی النظر میں ہی ہو جانا چاہئے تھا۔ چہ جائیکہ احتمالات

جاتے ہیں (مراسم تبدیل کرتے تھے)۔

اس کی متعدد حکمتیں ہو سکتی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں: دونوں راستے نمازی کی عبادت اور ذکر پر گواہی دیں، دونوں راستوں پر اسلامی شعار کا اظہار ہو اور دونوں راستوں پر بے نمازیوں اور اللہ کی عبادت سے غافل رہنے والوں کو اپنے عمل سے یاد خدا کی طرف مائل کیا جائے۔

ون وے ٹریفک کا نظریہ

اس کی ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک راستے سے جانے اور دوسرے راستے سے واپس آنے سے آنے جانے والوں کے لئے سہولت ہو، اثر و پام اور بھیڑ میں کمی واقع ہو اور گزرگاہ تنگ نہ ہو۔ ہم بجا طور پر دنیا والوں کے سامنے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اللہ کے پیارے رسول ﷺ نے جدید تمدن، معاشرت اور شہری زندگی کے مسائل کو اپنی تعلیمات کے ذریعے نہایت کمال انداز میں حل فرمایا ہے اور یہ کہ One Way Traffic کے اصولوں کے بانی ہمارے پیارے نبی ﷺ ہیں۔

عید نہ منانا

قوموں کی زندگی میں ایسے، حوادث اور مصائب پیش آتے رہتے ہیں اور بد قسمتی سے گزشتہ برسوں سے اس طرح کے المناک واقعات ہماری روزمرہ زندگی کا ایک معمول بن چکے ہیں۔ ایسے حوادث کے پیش نظر اکثر اوقات بعض افراد یا حلقوں کی جانب سے یہ سننے میں آتا ہے کہ اس سال ہم عید نہیں منائیں گے۔ اس طرح کے بیانات کے پیچھے یقیناً نیک نیتی، حب الوطنی، اخوت اسلامی اور انسانیت دوستی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عید نہ منانے کا مطلب کیا ہے؟ یہ کوئی جشن یا تہوار تو ہے نہیں، یہ تو عبادت اور سنت مصطفیٰ ﷺ ہے، اخوت اسلامی اور اتحاد امت کا مظاہرہ ہے، جمعیت قوم مسلم کا ایک حسین منظر ہے، اللہ کی بارگاہ میں دو گنا نماز عید کی ادائیگی کا نام ہے۔ شرافت، متانت اور نفاست ایسی انسانی خصوصیات کا مظہر ہے ان میں سے کوئی چیز اور کوئی بات ایسی نہیں جو عسر و یسر اور رخ و راحت ہر حال میں منائے جانے کے قابل نہ ہو۔ باقی رہا ہول و لعب میں مشغولیت، رقص و سرود کی محافل پر پا کرنا، ناؤ نوش اور محرمات شریعہ کا ارتکاب اور ہوس نفس کی تسکین کے سامان ہم پہنچانا، یہ ایسے امور ہیں جن کا اسلامی تصور عید سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جو ایک مسلمان کو نہ صرف عید کے مقدس موقع پر بلکہ زندگی کے ماہ و سال کے ہر لمحہ و لمحہ میں ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے چاہئیں بلکہ ان محرمات و منکرات شریعہ کو چھوڑنا ہی ایک مومن کامل کی حقیقی عید ہے اور ایسی عید اللہ تعالیٰ ہر بندہ مومن کو نصیب فرمائے۔

وامکانات کے دیہ پر پردوں میں اس کو چھپایا اور اقوال کی کثرت میں الجھنا اور الجھایا جاتا۔ کیونکہ مقصود کی طرف راہنمائی کرنے والی علامات کو چھپانا یا بہم رکھنا بنیادی مقصد اور حکمت کے خلاف ہوتا ہے۔

حضرت سیدنا موسیٰ علیہ علی نبینا افضل الصلوٰات والتسلیمات کی معیت میں بنی اسرائیل کے ستر افراد رب ذوالجلال کی ملاقات کیلئے جاتے ہیں۔ جب وہ سارے اللہ کی پکار میں آکر ہلاک ہو گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توبہ واستغفار کے ساتھ بارگاہ ایزدی میں دست دعا پھیلا دیئے۔ دعا قبول ہوئی اور جواب ملا:

قال عذابی اصیب بہ من اشاء^۱ ورحمتی وسعت کل شیء فساکتبھا للذین یتقون و یتؤتون الزکوۃ والذین ہم بائیننا یؤمنون الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوبا عندهم فی التورۃ والانجیل (۱)

”جسے میں چاہوں گا عذاب سے دو چار کروں گا اور میری رحمت ہر چیز سے وسیع تر ہے۔ پھر عنقریب میں اسے ان لوگوں کیلئے لکھ دوں گا جو تقویٰ اختیار کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، اور وہ جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔ وہ لوگ کہ جو اس رسول و نبی کی پیروی کریں گے، جس کا ذکر اپنے پاس موجود تورات اور انجیل میں پائیں گے۔“

پھر منقولہ تسلسل برقراری رہتا ہے اور نبی اکرمی کے خصائص کا ذکر آ جاتا ہے۔ اس سے صاف مترشح ہے کہ امی ہونا اس نبی معظم کا شناختی وصف ہے جو نبی موعود ہے۔ آپ ﷺ سے متعلق بشارات کا سلسلہ حضرت ابوالانبیاء سیدنا طفیل اللہ علیہ علی نبینا افضل الصلوٰات والتسلیمات کی دعا سے شروع ہوتا ہے۔ تورات کے حوالے سے اس دعا کا ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔ یہاں قرآن حکیم کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

ربنا وابعث فیہم رسولا منهم یتلوا علیہم آیتک ویعلمہم الکتب والحکمۃ ویزکیہم^۲ انک انت العزیز الحکیم (۲)

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! ان لوگوں میں خود انہی میں سے ایک عظیم المرتبت رسول مبعوث فرما تا جو ان کو میری آیات پڑھ کر سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ فرما دے، تو بڑا ہی مقتدر اور بہت حکمتوں والا ہے۔

یہ دعا خانہ کعبہ کی تعمیر کے عمل کے دوران مکہ مکرمہ میں مانگی گئی تھی۔ یہ چیز اس بات کا قرینہ ہے کہ جس نبی کی بعثت کی دعا مانگی گئی اس کی بعثت مکہ مکرمہ میں اور اہل مکہ ہی میں سے ہو۔ چنانچہ فہم اور منہسے انہی دو باتوں کا یقین ہو رہا ہے۔ آپ علیہ السلام کے ساتھ اس وقت چونکہ حضرت سیدنا اسماعیل علیہ السلام خانہ کعبہ کی تعمیر کے عمل میں شریک اور مصروف تھے اس لئے یہ دعا بھی آپ علیہ السلام کے حق میں ہوئی۔ مگر حضرت طفیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد اور آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے کے زمانوں میں نبوت و رسالت کا جو دور چلا وہ پورے کا پورا آپ علیہ السلام کے چھوٹے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے تعلق رکھتا ہے۔ اس اثناء میں بنی اسماعیل پہ خاموشی طاری رہی۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے عہد میں جس نبی موعود کی بعثت کی بشارت دیتے ہیں اس کی بنیاد وہ وحی الہی معلوم ہوتی ہے جس کا حوالہ تذکرہ بالا فرمان ایزدی سے ملتا ہے۔ اس موقع پر آپ علیہ السلام کو نبی موعود کی یہ علامت بتا دی گئی تھی کہ وہ ”امی“ ہوگا۔ اور آپ علیہ السلام کے بعد کوئی بھی اور نبی جو ”امی“ نہ ہوگا اس بشارت کا مصداق بھی نہ ہوگا۔ اس مسئلے میں علماء کرام کے اقوال میں جو تعدد اور گونا گونی پائی جاتی ہے اسی سے ان اقوال کی صحت و صداقت مشکوک ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جو موقف اختیار کیا اس میں ایک بے اعتدالی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ جس پر از سر نو غور و خوض اور اس موقف سے گریز ضروری ہے۔ اس موقف کی صحت تسلیم کر لی جائے تو اس گلے سے شان رسالت میں تنقیص کا پہلو نکلتا ہے۔ لکھتے ہیں:

”یہاں نبی ﷺ کے لئے امی کا لفظ یہودی اصطلاح کے لحاظ سے استعمال ہوا ہے۔ بنی اسرائیل اپنے سوا دوسری سب قوموں کو امی (گویم یا جنائکس) کہتے تھے اور ان کا قومی غرور کسی امی کی پیشوائی تسلیم کرنا تو درکنار اس پر بھی تیار نہ تھا کہ امیوں کے لئے اپنے برابر انسانی حقوق ہی تسلیم کر لیں۔ چنانچہ قرآن میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ”امیوں کے مال مار کھانے میں ہم پر کوئی مؤاخذہ نہیں“ (ال عمران آیت ۷۵) پس اللہ تعالیٰ انہی کی اصطلاح استعمال کر کے فرماتا ہے کہ اب تو اسی امی کے ساتھ تمہاری قسمت وابستہ ہے۔ اس کی پیروی قبول کرو گے تو میری رحمت سے حصہ پاؤ گے ورنہ وہی غضب تمہارے لئے مقدر ہے جس میں صدیوں سے گرفتار چلے آ رہے ہو۔“ (۳)

سارے آثار و قرآن تو یہی بتاتے ہیں کہ یہ کلمہ یہودی اختراع اور وضع کردہ اصطلاح ہے۔ اس حد تک تو مندرجہ بالا موقف درست اور حقائق کے موافق ہے۔ چونکہ یہود کا عیسائیوں کے مقابلے میں

اغت لوئیس کہتے ہیں:

”الامی من لا یعرف الکتابۃ ولا القراءۃ“ (۶) یعنی امی وہ ہے جو لکھنا جانتا ہو نہ پڑھنا۔

امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں:

”الامی هو الذی لا یکتب ولا یقرأ من کتاب“ (۷) یعنی امی وہ شخص ہے کہ جو کسی

کتاب سے پڑھ سکتا ہو نہ لکھ سکتا ہو۔

علامہ جلال اللہ زحیری کے نزدیک امی سے مراد یہودی بھی ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ایک مقام پر

”اقبونی“ سے ان پڑھ یہودی مراد لئے ہیں۔ فرماتے ہیں:

ومنہم اقبونی لا یحسنون الکتب فیطالعوا التوراة ویتحققوا ما

فیہا (۸)

ترجمہ: اور ان میں سے کچھ ان پڑھ ہیں، کتاب کے بارے میں بہتر معلومات نہیں رکھتے کہ تورات کا

مطالعہ کر سکیں اور یہ تحقیق کر سکیں کہ اس میں کیا کیا احکام ہیں۔

استاذی، علامہ قلام رسول سعیدی فرماتے ہیں:

”امی وہ شخص ہے جو لکھتا ہو نہ پڑھتا ہو، یعنی جس طرح ماں کے بطن سے ناخواندہ پیدا ہوا تھا اسی حالت پر

ہوا اور کسی سے علم حاصل نہ کیا ہو“ (۹)

ایک روایت میں ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر معاہدہ جب لکھا جانے لگا تو حضرت علی رضی

اللہ عنہ نے آپ ﷺ کا نام مبارک ”محمد رسول اللہ“ لکھ دیا۔ اس پر مشرکین مکہ معترض ہوئے کہ ہم آپ

(ﷺ) کو اللہ کا رسول مانتے تو پھر مجھڑا ہی کیا رہ جاتا۔ اور اصرار کیا کہ ”رسول اللہ“ کے کلمات ہٹا

دیئے جائیں۔ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ یہ کلمات ہٹا دیں۔ مگر آپ رضی اللہ

عنہ کو تامل ہوا۔ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

أرضی مکانہا فأراء مکانہا فمحاها وکتب ابن عبد اللہ (۱۰)

ترجمہ: مجھے وہ جگہ دکھاؤ جہاں ”رسول اللہ“ کے کلمات لکھے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہ جگہ

دکھائی جہاں یہ کلمات لکھے ہوئے تھے تو آپ ﷺ نے ان کلمات کو مٹا کر ”ابن عبد اللہ“ لکھ دیا۔

حضرات شارحین حدیث نے اس روایت کے ذیل میں بڑی طویل اور تفصیلی بحثیں درج کی

جزیرہ قماریہ عرب میں اثر و رسوخ زیادہ تھا اس لئے بے خوف تر وید کہا جاسکتا ہے کہ امی کا لفظ غیر اہل

کتاب کے معنی میں انہوں نے ہی استعمال اور رائج کیا۔ مگر عوامی سطح پر عام استعمال میں آ جانے والے

ایک کلمے میں یہودی مکروہ ذہنیت کے آثار تلاش کرنا اور اس کو ان کی کسر سوچ سے آلودہ کر دینا قطعاً

مناسب نہیں۔ زیر بحث آیت مبارکہ کی صورت کا حصہ ہے۔ اگر ایسی کوئی آلودگی پائی جاتی تو یہ کلمہ کسی کی

سورت میں آپ ﷺ کی صفت کے طور پر شامل تو ہرگز نہ ہوتا کہ یہاں تو ابھی یہودی کا سامنا ہی نہیں

ہے۔ نہ ان کی زیر دستی یا بالادستی کا سوال ہی ہے۔ پھر یہ بھی تو دیکھئے کہ یہ تو ایسے ہی ہوا جیسے آپ ﷺ

کے نام نامی ام گرامی کو بگاڑ کر مذم کہنے والوں کو چڑانے کے لئے وحی ’ الہی اس کلمے کو آپ ﷺ کا

وصف ظاہر کرتے ہوئے یہ تاثر پیدا کرے کہ آج تم اسی مذم کے رحم و کرم پر ہو۔ عیاذ اللہ! یہ پہلو

دھیان میں ہوتا تو سید ابوالاعلیٰ مودودی یہ مؤقف یقیناً اختیار نہ کرتے۔ ان فرض یہودیہ کلمہ غیروں کے لئے

ضرور استعمال کرتے تھے مگر نفرت و حقارت کے اظہار کے لئے نہیں، جداگانہ شناخت کے طور پر استعمال

کرتے تھے۔

”جو علم خدا کے نام کے بغیر ہو وہ انسانیت کی تباہی کا سبب بنے گا“ کے نام سے طبع ہو کر عام

لوگوں کے استفادے کے لئے تقسیم ہونے والے ایک مختصر کتابچے میں سید ابوالحسن علی ندوی کا زور اس

بات پر ہے کہ امی کا معنی ”ناخواندہ ہونا“ ہے:

”جس پر یہ وحی نازل ہو رہی ہے وہ خود بھی ناخواندہ امی ہے، اس کی پوری قوم ان پڑھ ہے، یہودیوں نے

بھی ان کو امین کے لقب سے پکارا ہے۔“ (۱۱)

بیر کرم شاہ الازہری کا بھی اس معاملے میں کوئی قول معنی نہیں۔ فرماتے ہیں: ”حضور ﷺ کو ”الامی“

کہنے کی متعدد وجہات علماء کرام نے بیان کی ہیں“ پھر حسب ذیل وجہات نقل کرتے ہیں:

۱۔ ”منسوب الی الام یعنی ہو علی ما ولدته امہ لم یکتب ولم

یسقرأ،“ یعنی یہ کلمہ ام یعنی ماں کی طرف منسوب ہے۔ وہ شخص جو اسی حال پر ہو جس پر اس کی ولادت

ہوئی کہ نہ لکھتا نہ پڑھا۔

۲۔ بعض نے کہا ہے کہ ام القری (مکہ مکرمہ) کی طرف نسبت کی وجہ سے امی کہا گیا۔

۳۔ بعض کی رائے ہے کہ امی امت کی طرف منسوب ہے۔ یعنی حضور ﷺ صاحب

امت ہیں۔ (۱۲)